P. O. RGD. No. A 922

ہماری زبان

انجمن ترقی اُردو (ہند) علیگڈھ کا پندرہ روزہ اخبار

قیمت فی پرچہ دو آنے

سالانہ چندہ دو روپے

جلد ۱۰ | یکم مئی سنہ ۱۹۵۱ء | ایڈیٹر- قاضی عبدالغفار | ۲۳ رجب المرجب ۱۳۷۰ ہجری | نمبر ۲۳

کچھ اپنی باتیں

ہم ذیل میں 'مدینہ' بجنور کا ایک اداریہ نقل کرتے ہیں۔ ممکن ہے اسے پڑھ کر بعض اصحاب کو یہ شکایت ہو کہ اس کا لہجہ ضرورت سے زیادہ تلخ اور طنز آمیز ہے لیکن جس مسئلے سے اس اداریہ میں بحث کی گئی ہے وہ اتنا اہم اور ضروری ہے کہ اس تلخی کو نظر انداز کر کے اصل سوال پر ملک کے ہر بہی خواہ کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے۔ ہم خاص طور پر آل انڈیا ریڈیو کے ارباب حل و عقد اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو اس کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں:-

آل انڈیا ریڈیو کی زبان

ہند پارلیمنٹ میں محکمہ اطلاعات و نشریات کی جانب سے پیش کردہ مطالبات کی رقم پر بحث کے دوران میں ایوان کے مختلف گوشوں سے اعتراضات کئے گئے۔ مسز کلا چودھری نے کہا کہ "آل انڈیا ریڈیو کے ذریعہ عام انتخابات کے بارے میں عوام کو پوری واقفیت بہم پہنچانا ضروری ہے۔ اگرچہ آل انڈیا ریڈیو کے نشریہ پروگرام پہلے سے بہتر نظر آتے ہیں مگر ان میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ قدرتے مصنوعی معلوم ہوتی ہے" مسز امو سوامی ناتھن نے کہا کہ آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام عوام میں مقبولیت حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ممکن ہے ملک میں ریڈیو سیٹوں کی تعداد قابل افسوس حد تک کم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہو" خاتون محترم نے آگے چل کر فرمایا کہ "حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ عوام کو ریڈیائی نشریات کے ذریعہ تعلیم دے' اس لئے ریڈیائی پروگرام کو عام طور پر سمجھے جانے کی تنظیم دوسری طرز پر کی جانی چاہئے" گیانی گرمکھ سنگھ مسافر نے کہا کہ "آل انڈیا ریڈیو سے جو ہندی استعمال کی جاتی ہے اسے آسان کرنا چاہئے۔ اس وقت جو زبان بولی جاتی ہے وہ اس قدر مشکل ہے کہ کشمیر میں مقیم ہندوستانی افواج بعض اوقات پاکستانی ریڈیو سننا زیادہ پسند کرتی ہیں۔

اور وزیر متعلقہ مسٹر آر' آر' دیوا کر نے کیا مزے کا جواب دیا ہے ان حقائق کا'

فرماتے ہیں "وزارت اپنے محدود ذرائع میں وہ سب کچھ کر رہی ہے جو اس کے لئے ممکن ہے زبان کی پالیسی کے بارے میں جہاں تک ہندی کا تعلق ہے ایک مشاورتی کمیٹی مقرر کی جا چکی ہے اس کے پہلے جلسے میں متفقہ طور پر یہ اصول طے پا چکا ہے کہ "استعمال کی جانے والی زبان کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں"۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ نہ سمجھ میں آنے والی زبان کب سے بولی جا رہی ہے؟ ہوتے چار سال ہونے کو آئے اس تمام مدت میں ملک کے ہر کونے سے احتجاج کیا گیا۔ تقریریں ہوئیں مضامین لکھے گئے۔ مہاتما گاندھی تو آخری لمحہ تک اس کانٹے کی تکلیف سے نجات نہ پا سکے اور آج بھی جو دو چار گنے چنے باپو کے اصولوں پر چلنے والے رہ گئے ہیں وہ اپنی وڑھی مذہبوں کانپتے ہوئے ہاتھوں اور تڑپتے ہوئے دل کے ساتھ التجائیں کر رہے ہیں ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جا جا کے پکار رہے ہیں تاکہ کوئی تو ان کی بات سن لے مگر اسکا حاصل؟

وزیر صاحب فرماتے ہیں کہ "ہم نے ایک کمیٹی مقرر کر دی ہے" اور کمیٹی بھی کیسی "مشاورتی" یعنی جو صرف مشورہ دے گی۔ اب رہا ان مشوروں کو قبول کرنے اور عملی جامہ پہنانے کا سوال، تو اگر حکومت کے "محدود ذرائع" نے اجازت دی تو ضرور ایسا کیا جائے گا۔ اور دیکھئے "محدود ذرائع" کب تک اجازت دیتے ہیں پھر نہ تو جناب وزیر صاحب نے ہی یہ فرمایا کہ یہ کمیٹی کب مقرر کی گئی اور کتنے عرصے بعد اس کا پہلا جلسہ ہوا اور اس جلسہ میں اس ایک اصول کے علاوہ بھی کچھ طے ہوا یا نہیں، نیز یہ کہ یہ کمیٹی کن افراد پر مشتمل ہے، مشورہ دینے کی حدود کیا ہیں اور کب تک یہ کمیٹی اپنی رپورٹ مکمل کرے گی اور نہ ان ہی کے کسی کرمچاری کو اس وقت یہ باتیں سوجھیں جو وزیر صاحب سے دریافت کر لی جاتیں۔ وزیر صاحب کو تو یقیناً اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ وہ یہ تمام معلومات بغیر مطالبہ کئے ہوئے ایوان کے سامنے پیش کرتے لیکن ہم ان ممبران سے تو پوچھتے ہیں جو تھوڑی دیر پہلے تو گرمجوشی کے ساتھ آل انڈیا ریڈیو کی پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کر رہے تھے۔ اور جب وزیر صاحب نے کہہ دیا کہ ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی ہے تو وہ مطمئن ہو گئے۔ کیا انہیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ یہ کمیٹی آل انڈیا ریڈیو کی زبان کو سدھارنے میں کامیاب ہو سکے گی اور اس کو اس قابل بنا دے گی کہ کشمیر کی سرزمین پر جمہوریت کی حفاظت کرنے والا حاصل سپاہی اپنے فرصت کے اوقات میں ریڈیو کے پاس بیٹھ کر اپنے دل و دماغ کو تر و تازہ کر لیا کرے گا۔ اس چار سال کی مدت میں پروپیگنڈے پر جس قدر روپیہ صرف کیا گیا ہے وہ بڑی حد تک ضائع ہوا ہے۔ اس لئے کہ پروپیگنڈے کے لئے جو زبان اختیار کی گئی وہ ملک کے کروڑوں باشندے سمجھنے سے قاصر تھے۔ صرف چند گنے چنے انسان ایسے ہیں جو اس زبان کو سمجھ سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ملک کو آزاد ہوئے اگرچہ ۴ سال ہوئے مگر آج بھی عوام کے ذہنوں میں آزادی کا صحیح تصور نہیں پایا جاتا ایسی حالت میں کمیشن بنانا اور ان سے اصول وضع کرانا بیکار ہے زبان کے بارے میں مہاتما گاندھی نے صاف اور سیدھا راستہ دکھا دیا تھا مگر ہندوستانی قوم نے ثابت کر دیا کہ وہ کس قدر ناسپاس ہے۔ گاندھی جی کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی سارے اصولوں کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے جب ہم انہی اصولوں پر عمل نہ کر سکے تو نئے اصول بنا کر ان پر کیا عمل کر سکیں گے؟ روسو کہتا ہے "وہی قوم حقیقی معنی میں آزاد ہے جو اپنے لئے اصول و قوانین بنا کر انہیں عملی جامہ پہناتی ہے"۔ لیکن

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

(مدینہ بجنور)

غلط رجحان

کوئی سال بھر ہوا میں نے 'نقاد' (بمبئی) میں راجندر سنگھ بیدی کا ایک خطبۂ صدارت پڑھا جس میں انہوں نے میر تقی میر کی شاعری کے متعلق ایک دو جملوں میں یہ کہا تھا کہ ہم اس سے سوائے زبان اور سادگی کے اب اور کچھ نہیں سیکھ سکتے۔ اس وقت میرے پاس 'نقاد' کا وہ نمبر نہیں ہے کہ میں بیدی کے الفاظ کا اقتباس نقل کروں لیکن اُن کا مفہوم یہی تھا۔ اتفاق ہے میں ان دنوں میر کے کلیات کا ایک بار پھر مطالعہ کر رہا تھا اس لئے کہ میر میرے محبوب ترین شاعروں میں سے ہے بیدی کے اس جملے کو پڑھ کر میرے دل کو سخت چوٹ لگی۔ لیکن چونکہ بیدی خود ایک سنجیدہ اور اعلیٰ درجہ کے ادیب ہیں اور ترقی پسند ادب کی تحریک میں وہ اور میں رفیق کار ہیں اس لئے میرے لئے یہ ضروری تھا کہ ان کی رائے کو اہمیت دوں اور سوچوں کہ غلطی پر کون ہے وہ یا میں۔ میں چاہتا تھا کہ 'نقاد' میں اس مسئلے کے متعلق کچھ لکھوں لیکن اس کی فرصت نہیں ملی اور معاملہ وہیں کا وہیں رہ گیا۔

چند دن ہوئے شاہراہ (دہلی) کا نومبر ۵۰ء کا شمارہ میری نظر سے گذرا۔ اس میں میں نے اپنے دوست ہنسراج رہبر کی تنقید خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "مرزا شوق لکھنوی" پر پڑھی بدقسمتی سے یہ کتاب مجھے دستیاب نہیں ہو سکی۔ رہبر نے اپنی تنقید میں مرزا شوق کی مثنویوں 'زہر عشق' اور 'بہار عشق' پر ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے:-

'مثنوی پڑھنے کے بعد ہمارے دل میں مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں' کیا مرزا شوق نے محض زندگی کی ترجمانی ہی کی ہے' اسے بلند نہیں کیا' ان کی پستی میں عفونت ہی عفونت ہے؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اس پستی میں عفونت کے سوا اور کچھ نہیں۔ سیہ کاری اور عیش کوشی کی کہانیاں بیان کر کے زندگی کو بلند کرنے کی بات کہنا زندگی کو منھ چڑانا ہے۔ فاروقی صاحب معاف فرمائیں کہ انہوں نے گڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے ادب میں اس دور کی عفونت ہی کچھ کم نہیں کہ مرزا شوق کی فحش نگاریوں کو دہرایا جائے۔"

میں نے شوق کی "بہار عشق" نہیں پڑھی ہے اس لئے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن رہبر کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا تبصرہ شوق کی دونوں مثنویوں پر ہے یعنی وہ زہر عشق کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس میں سیہ کاری 'عیش کوشی' کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس میں زندگی کو بلند نہیں کیا ہے اس میں فحش نگاری' اور عفونت ہے اور بہتر یہ ہے کہ شوق کی مثنوی کو شائع کر کے گڑے مردے نہ اکھیڑے جائیں۔

مجھے زہر عشق کے اس تجزیے سے قطعی اختلاف ہے۔

زہر عشق میں ایک بہت سیدھا سادھا اور نہایت دردناک واقعہ بیان کیا گیا ہے ایک نوجوان مرد اور ایک خوبصورت لڑکی جو پاس کے گھروں میں رہتے ہیں اتفاق سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں۔ وہ دل و جان سے ایک دوسرے پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ان میں خط و کتابت شروع ہوتی ہے۔ بعد میں چوری چھپے اُن کی ملاقاتیں ہوتی ہیں کچھ دنوں کے بعد لڑکی دو مہینے تک لڑکے سے ملنے نہیں آتی آخر ایک رات جب وہ آتی ہے تو کہتی ہے کہ اس کے گھر والوں کو اس محبت کا پتہ چل گیا ہے۔ لوگ اس پر آوازے کستے ہیں۔ اس کے والدین میں:-

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں
بھیجتے ہیں ہمیں بنارس میں

اب وہ نہ تو یہ روز روز کی ذلت برداشت کر سکتی ہے اور نہ اُس سے جدائی کا ہی الم اٹھایا جائے گا۔

وہ چھٹے ہم سے جسکو پیار کریں
جبر کیوں کر یہ اختیار کریں

اس لئے اب وہ زہر کھا کر مرجانا ہی بہتر سمجھتی ہے۔ لڑکی اپنے عاشق کو سمجھاتی ہے۔

ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتہ
نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتہ
بوئے الفت تمام پھیلی ہے
باقی اب قیس ہے نہ لیلی ہے۔

موت اور زیست کی چند باقی گھڑیوں میں وہ کتنا ظاہر کرتی ہے کہ:

پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو
آج دل کھول کر گلے مل لو
حشر تک ہو گی پھر یہ بات کہاں
ہم کہاں تم کہاں یہ رات کہاں

نوجوان کو ان باتوں کا یقین نہیں آتا تھا لیکن دوسرے دن جب پاس کے گھر سے رونے دھونے کی آواز آئی تو اسے یقین آگیا کہ واقعی اس کی محبوبہ زہر کھا کر مرگئی۔ کرب اور بے بسی کے عالم میں نوجوان نے بھی زہر کھا لیا لیکن خواب میں اسے اپنی محبوبہ نظر آئی اور اس نے اسے یاد دلایا کہ میں نے تم سے وصیت کی تھی کہ میری وجہ سے تم اپنی جان نہ دینا اب یہ تم کیا کر رہے ہو؟

دل سے میرا بھلا دیا کہنا
ہاں یہی چاہیئے تھا کیا کہنا

اس خواب کے بعد گویا وہ دوبارہ زندہ ہو گیا مثنوی اس شعر پر ختم ہوتی ہے۔

عشق میں ہم نے یہ کمائی کی
دل دیا غم سے آشنائی کی

مرزا شوق کی یہ مثنوی تاثر، سلاست، شیریں بیانی، حقیقت نگاری اور گہری المناکی کے لحاظ سے اردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس المیہ کا اس میں ذکر کیا گیا ہے وہ فی الحقیقت عورت کا المیہ ہے، جسے جاگیری سماج میں محبت کرنے کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ شوق کی ہیروئن تو زہر کھا کر مرجاتی ہے لیکن وہ جو زہر نہیں کھاتیں ان کا کیا حال ہوتا ہے؟ جاگیری مذہبی عقیدہ، رواج، اخلاق انہیں یہ سبق سکھاتا ہے کہ آزادی سے محبت کر کے اپنی مرضی سے اپنا شریک زندگی چننا، شریف بہو بیٹیوں کا شیوہ نہیں ہے۔ شادی ایک فرض ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عورتیں مرد کی خدمت کریں اور اولاد پیدا کریں۔ ایک طرف جاگیری نظام کے مذہبی اور اخلاقی تصورات دوسری طرف مرد کی معاشی جکڑ بندی عورتوں کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ سماجی نظام اور اسی مرد کی تابع اور فرمانبردار ہیں جو کہ دوسروں نے ان کے لئے چن دیا ہے۔ جب ان کی محبت کوئی اختیاری چیز نہیں۔ جاگیری سماج میں مردوں کے بھی یہی فرائض تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مردوں نے اپنے لئے آزاد محبت کی دوسری راہیں نکال لی تھیں۔ انہیں اس کا اختیار تھا کہ وہ طوائفوں، لونڈیوں وغیرہ سے عشق کریں۔ اس فعل کو "گناہ" کہنے کے بعد بھی سماج مردوں کو اس کی اجازت دیتا تھا، یہ ایک تسلیم شدہ بات تھی لیکن سماج کے ان ظالمانہ "اخلاقی" اصول اور رسوم کے خلاف ہمیشہ بغاوت ہوتی رہتی تھی۔ سماج کے معاشی نظام کی سطح پر اگر ہم دیکھیں تو غلامی کے عہد میں غلاموں نے آقاؤں کے خلاف بڑی بڑی بغاوتیں کیں، جاگیری عہد میں کاشتکار نیم غلاموں نے مسلسل بغاوتیں کیں۔ یہی بغاوتیں تاریخ کا ارتقائی عمل تھیں۔ بادی النظر میں اور بورژوا مورخین کے نزدیک یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بغاوتیں ناکام ہوئیں اور آقا اور جاگیردار دوبارہ ان کو دبا کر اپنی خونی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے 'ان ناکام' بغاوتوں کے بعد مظلوم محنت کش طبقہ پہلے کے مقابلہ میں اپنے لئے زیادہ حقوق حاصل کر لیتا تھا اور گو کہ اس کا استحصال جاری رہتا تھا۔ لیکن اس کی پوزیشن پہلے کے مقابلہ میں معاشی اور اخلاق اور نظریاتی

طور پر پالنے سے بہتر ہو جاتی تھی۔ سماج ایک زیادہ اونچی سطح پر پہونچ جاتا تھا۔

بالکل اسی طرح اگر ہم انسانی سماج میں جنسی محبت کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ عہد وحشت (جب کہ قدیم اشتراکی نظام قائم تھا) عہد غلامی عہد جاگیری، عہد سرمایہ داری اور اب عہد اشتراکیت کے آغاز میں جنسی محبت کا بھی ارتقا ہوا ہے اور اس ارتقا میں جدلیت کا اصول کارفرما رہا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو جنسی جبلت ہے اور دوسری طرف سماج کا معاشی، سیاسی اور اخلاقی نظام ہے۔ ہر مخصوص عہد اور سماجی نظام میں جنس کی بنیادی جبلت کو پورا کرنے کے لئے ایسے قانون اور رسوم وضع کئے جاتے ہیں جو اس سماج کی ضروریات کو پورا کریں اور اُن کے مطابق ہوں۔ لیکن یہ قوانین اور رسوم آسمان سے نازل نہیں ہوتے، یا کسی بڑے آدمی کی طرف سے سماج پر مسلط نہیں کئے جاتے بلکہ انسان اجتماعی طور پر اپنے زندگی کے تجربے سے یعنی مختلف طبقوں کے تصادم اور اُن سے پیدا ہونے والے اخلاقی یا مذہبی خیالات کے تصادم اور جدل کے نتیجے کے طور پر رفتہ رفتہ وضع ہوتے ہیں اور سارے سماج پر چھا جاتے ہیں۔ سماج کے ارتقا کے ساتھ ساتھ محبت کے جذبہ کا بھی ارتقا ہوا ہے۔ اس میں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ گہرائی، انفرادیت اور نزاکت پیدا ہوئی ہے۔ مختلف عہدوں کی عشقیہ شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ اس تبدیلی کی شہادت ہیں۔

مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کے متعلق جذبات، تصورات، رسوم و رواج (جو مختلف دوروں میں مختلف رہے ہیں) ایک طرف جنسی جبلت اور دوسری طرف سماجی ضرورتوں کے تقاضوں کا اظہار کرتے ہیں۔ عشقیہ شاعری اس ضروری اور لازمی سماجی واقعے کے اظہار کا ایک پہلو اور ایک مخصوص فنی طریقہ ہے۔ ہم اچھی اور بہترین عشقیہ شاعری اس شاعری کو کہیں گے جو ایک خاص عہد اور دور میں سماج کے بہترین اور بلندترین جنسی محبت کے جذبے کا اظہار کرے، جس کی وجہ سے مرد اور عورت کے جنسی تعلق زیادہ لطیف، حسین، نرم، متوازن اور گہرے ہوں۔ جس کی وجہ سے جنسی معاملات میں سماج کے ترقی پسند تقاضے پورے ہوں اور جو محبت کے جبلی جذبے کو اس کی جنسی سطح سے بہلا کر سماج میں عام طور سے انسان دوستی، شرافت، خلوص، مودت اور تہذیب کے جذبات پیدا کرے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جنسی محبت کا جذبہ ایک عظیم تہذیبی قوت بھی ہے، اور اظہار صرف بالغ مرد اور عورت کے مخصوص تعلقات اور افزائش نسل کی شکل میں ہی نہیں ہوتا بلکہ تمام فنون لطیفہ کی تخلیق اور اس سے آگے بڑھکر والدین اور اُن کی اولاد بھائی بہن بھائی بھائی، دوستوں اور رفیقوں میں باہمی التفات، ہر انسان میں ہمدردی اور انسانیت، ترحم، مدارات اور شائستگی پیدا کرنے میں بھی اس کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ از منہ وسطی میں تصوف یا بھگتی کے فلسفے میں عقیدہ رکھنے والے مخلص بزرگ جب عشق مجازی اور عشق حقیقی میں قریبی تعلق بتاتے تھے تب وہ در اصل اسی سچائی کا اظہار ایک غیر سائینسی اور ابتدائی طریقے سے کرتے تھے اور اسی سبب سے رجعت پرست، کٹر مذہبی قسم کے لوگ ان سے ناراض رہتے تھے۔

یہ ہیں وہ اصلی اسباب جن کی وجہ سے ہر دور اور ہر عہد میں بہترین انسانوں اور فنکاروں نے عشق اور محبت کے موضوع پر عظیم ترین فن کی تخلیق کی ہے اور اس کے وسیلے سے انسانی دل میں حرارت، رقت اور انکی روح میں حلاوت اور تابندگی پیدا کی ہے۔

اس کا کیا سبب ہے کہ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، نل دمن، ہیر رانجھا کی محبت کی داستانوں کو اور اسی قسم کی اور داستانوں اور انھوں کے منظوم تذکرے کو پوری پوری قوم، کڑوروں عوام نے صدیوں تک اپنے سینے سے لگایا؟ یہی کہ ان داستانوں اور نظموں کے مصنفوں نے اپنی تخلیقوں میں نہ صرف اپنے عہد کے بلندترین اخلاقی اور انسانی جذبات کا فنکارانہ اظہار کیا، انھوں نے ان المیوں کے ذریعے سے انسانوں کے محبت کرنے کے حق کے لئے بھی جدوجہد کی اور ان فرسودہ سماجی بندھنوں کے خلاف سخت احتجاج کیا جو معمولی انسانوں سے مذہب، رسم رواج یا طبقہ واری تفریق کی بنا پر اس حق کو بیدردی سے کچل دیتے تھے۔ یہ عوام کی انفرادی آزادی

کی جدوجہد کا ایک حصہ تھا جو کہ طبقہ واری سماج میں مسلسل جاری ہے۔

یہی نہیں ان داستانوں اور نظموں میں ان کے قبیلہ داری یا جاگیرداری خول کے باوجود، اور اس بات کے باوجود کہ آج ہم بہت سے ان مذہبی یا اخلاقی تصورات کو مسترد کر دیتے ہیں جو کہ ان میں پیش کئے گئے ہیں، اس کے باوجود کہ موجودہ سماجی اور معاشرتی ماحول اس سے بہت مختلف ہے جس کا ان میں ذکر کیا گیا ہے پھر بھی یہ نظمیں، داستانیں اور اشعار ہمارے لئے آج بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ عشق و محبت کا لازوال شعلہ جب تک انسانی قلب میں فروزاں ہے، جب تک فطرت یا سماج کے ناساعد حالات کے خلاف انسان کی جدوجہد و کاوش جاری ہے اور جب تک انسانی شعور ارتقا کی نئی منزلیں طے کرتا ہوا اپنی زندگی اور احساسات کو ہر دم نئی اور بہتر اور زیادہ حسین ترتیب دیتا ہے اور ہر لحظہ پہلے سے زیادہ حسین خواب دیکھتا ہے اور ان احساسات اور خوابوں سے حسن کی تخلیق کرتا ہے اس وقت ہم کو ماضی کی ہر وہ فنی تخلیق متاثر کرے گی اور ہماری زندگی کو زیادہ مہذب اور حسین بنائے گی جس میں اس قسم کی خواہشات، جذبات اس طرح کے خوابوں اور خیالوں کا کامیابی کے ساتھ اظہار کیا گیا ہے۔

بعض ادیب اور رہبر معلوم ہوتا ہے ایسا نہیں سمجھتے۔ ان کی منطق غالباً یہ ہے کہ چونکہ میر اور شوق جاگیری عہد کے شاعر ہیں، چونکہ وہ شعوری طور پر اس عہد کے فلسفے اور عقیدے اور اخلاق کو مانتے تھے اور چونکہ جاگیری عہد کے محبت کے متعلق خیالات رجعت پسند تھے، اس لئے ان کی شاعری ہمارے لئے فضول اور بیکار ہے۔ ہمیں ان سے کچھ نہیں مل سکتا۔ ایسا سمجھنا گمراہ کن ہے۔

یہ صحیح ہے کہ میر اور شوق کے فلسفیانہ اخلاقی تصورات جاگیری عہد کے تھے، اس لئے ہم ان کو قبول نہیں کر سکتے۔ لیکن ان کی فنکارانہ تخلیق صرف یہی نہیں ہے، اس میں اس سے بہت زیادہ اور باتیں بھی ہیں۔

شوق کی زہر عشق میں محبت کے گہرے جذبات کا اظہار سچائی، درد اور بڑی انسانیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس میں ایسی محبت کے گہرے العیہ کا بڑی سادگی اور ہمدردی کے ساتھ اظہار کیا گیا ہے جس کے بار آور ہونے کی جاگیری سماج اجازت نہیں دیتا تھا۔ زہر عشق میں ایک طرف تو سماج کے رسوم اور تصورات کا تذکرہ ہے، دوسری طرف اس میں دو معمولی انسانوں کی سچی محبت کا بیان کیا گیا ہے آخر میں ہمیں ان دونوں سے ہمدردی اور جاگیری سماج کے ظالمانہ قوانین اور رسوم سے نفرت ہوتی ہے۔ مثنوی ہرگز پست قسم کے فحش جذبات کو برانگیختہ نہیں کرتی، اسے پڑھ کر لوگ زیادہ پاک اور زیادہ گہری محبت کرنا چاہیں گے، ان کا تزکیہ نفس ہوگا، ان میں دردمندی اور انسانیت کے جذبات ابھریں گے، ان کی زندگی کسی قدر زیادہ مہذب ہوگی۔

پرانے زمانہ کی بہترین عشقیہ شاعری (جس میں میر کے اچھے اشعار اور غزلیات شامل ہیں) چونکہ گہرے انسانی جذبات کا سچا اور حسین اظہار کرتی ہے، چونکہ وہ سنگدلی کے بجائے دردمندی، ظلم و ستم کی جگہ مہر و وفا کی تلقین کرتی ہے، چونکہ وہ زندگی، فطرت اور سماج میں حسن کی متلاشی ہوتی ہے، اس لئے وہ ہمارے لئے ایک بیش بہا تہذیبی جوہر ہے۔ آج زوال پذیر طبقے (جاگیردار اور سرمایہ دار) اور ان کے رجعت پرست اور بد تہذیب نمائندے عوام کی اس دولت کو ان سے چھین لینے کے درپے ہیں۔ وہ محنت کشوں اور دانشوروں کو بھوکا ہی نہیں مارتے، ان کو مہذب زندگی کے تمام ضروری مادی وسائل سے ہی محروم نہیں کرتے، انہوں نے محبت کو بھی جنس بازاری بنا دیا ہے۔ عوام کو محبت کرنے کے حق سے محروم کر دیا ہے اور سماجی رشتوں میں سے ہمدردی اور انسانیت کو بالکل خارج کر دیا ہے۔ ان کی درسگاہوں، کتابوں اور رسالوں میں انسان دوستی اور حیات آفرینی کا نہیں، انسانوں سے نفرت اور زندگی سے گریز کا سبق دیا جاتا ہے۔ ان کا منتہائے کمال ایٹمی طاقت اور ریڈیائی شعاعوں کو استعمال کر کے تمام بنی نوع انسان کو ہلاک کر دینے کا منصوبہ بنانا ہے، اور یہی بات انسانیت کو یہ بشارت دیتی ہے کہ انسانیت نہیں بلکہ اس کے بدخواہوں کے خاتمے کی آخری گھڑیاں قریب آ گئی ہیں۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ بیدی اور رہبر جیسے حساس اور انسان دوست ادیب آج ترقی پسندوں کے پلیٹ فارم سے ایسے کلمے کہیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ ماضی کی زندگی اور انسانیت سے بیزار ہیں، عشقیہ شاعری کو پسند نہیں کرتے، اس سے متاثر اور مستفید نہیں ہوتے، اس کو بیکار اور نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ بالکل یہی برطانوی سامراجی اور لکھنو کے نوابین بھی سمجھتے تھے جنہوں نے مثنوی زہر عشق کی اشاعت اور طباعت کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ بالکل یہی رویہ آج ہمارے ملک کے ان غیر مہذب وزیروں اور امیروں اور ان کے خوشہ چینوں کا ہے جو اردو اور ہندی کی لڑائی لڑانا تو خوب جانتے ہیں لیکن جن میں میر یا غالب، سور داس یا رس کھان کی ایک سطر بھی سمجھنے یا محسوس کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ان کا رویہ تو ہماری سمجھ میں آ سکتا ہے اس لئے کہ وہ تو جہالت اور تنزل کے علمبردار ہی ہیں۔ ترقی پسندوں میں اس قسم کے رجحانات اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ مردود طبقوں کے زوال پذیر نظریے اور خیالات کبھی کبھی غیر شعوری طور پر ہمارے اندر بھی سرایت کر جاتے ہیں، بظاہر وہ بڑے "انقلابی" طور سے پیش کئے جاتے ہیں، مثلاً کہا یہ جاتا ہے کہ "ہم تو انقلابی ہیں، ترقی پسند ہیں، ہمیں عشق و محبت کی شاعری سے دور رہنا چاہئے" لیکن ان کا مطلب یہ ہوتا ہے:- "ہم دشمن طبقوں کے غیر انسانی اور غیر مہذب رویے اور نظریے کو بسر و چشم قبول کرتے ہیں۔ ہم ماضی کے عظیم انسانی ورثے کو مسترد کرتے ہیں ہم نامکمل، بے حس اور مجہول رکھے جانے پر قانع ہیں"۔

ظاہر ہے کہ یہ نقطہ نظر غلط ہے اور ترقی پسند اسے ہرگز قبول نہیں کر سکتے ہیں اس قسم کے تمام رجحانات کے خلاف جدوجہد کرنا چاہئے۔

("شاہراہ" دہلی)

آرزو لکھنوی مرحوم

۱۹۵۰ء کا اختتام تو انتہائی تکلیف دہ ثابت ہوا یہ ۱۹۵۱ع کا آغاز ہے ان چند ماہ میں، اردو ادب کو پے در پے شدید نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔

سب سے پہلے صفی لکھنوی کے انتقال کی خبر ملی۔ پھر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر تاثیر کا انتقال ہو گیا۔ ابھی ادب شناس حلقہ ان حادثات کو بھولنے نہ پایا تھا۔ کہ معلوم ہوا کہ تاجور نجیب آبادی۔ اور سیماب اکبرآبادی جیسے ادبی ستون بھی منہدم ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت ناطق لکھنوی کا حادثہ ارتحال بھی پیش آ ہی گیا۔ اب خبر آئی ہے کہ آرزو لکھنوی بھی ہم سے جدا ہو گئے۔

تاثیر اور تاجور کے کارنامے کسی طرح بھلائے نہیں جا سکتے۔ ناطق اور سیماب کا ادبی اور شعری مقام سب کے نزدیک مسلم ہے۔ لیکن جانشین جلال حضرت انور حسین آرزو صاحب جن خصوصیات کے حامل تھے اور انہوں نے اردو زبان کی جس طرح خدمت انجام دی تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ علم عروض میں ان کا مرتبہ اپنے استاد جلال مرحوم کے بعد مسلم تھا۔ جہان آرزو۔ فغان آرزو اور سریلی بانسری، ان کی ایسی شعری یادگاریں ہیں کہ اب لکھنؤ اسکول سے ایسی بلند پایہ تخلیقات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ باوجود اس شعری کمال کے ان کی زندگی جس عالم میں بسر ہوئی اس کا تصور بھی تکلیف دہ ہے۔ اور ہندوستان کا ہر ادیب اور شاعر آج اسی دور سے گذر رہا ہے۔ آخر کار مشکلات سے نجات حاصل کرنے کے لئے حضرت آرزو نے فانی دنیا کی سیر کی اور اس طرح اپنی معاشی مشکلات کے حل کے علاوہ، زبان و ادب کی خدمت کا ایک نیا راستہ پیدا کیا۔

حضرت صفی۔ حضرت ناطق۔ حضرت تاجور اور حضرت سیماب کے انتقال کے بعد حضرت آرزو کا انتقال صرف ناقابل تلافی نقصان ہی نہیں بلکہ ان کے انتقال نے ایک دور کا خاتمہ ہی کر دیا۔

انجمن کی خبریں

قصبہ گوپامئو ضلع ہردوئی

کا خصوصی ادبی مشاعرہ زیر سرپرستی شاخ انجمن ترقی اردو ۱۵ اپریل سنہ ۱۹۵۰ع کو جناب حکیم ناظم حسین صاحب ناظر صدر انجمن کے دولت خانہ پر ایک خصوصی مشاعرہ زیر صدارت جناب سید اعجاز حسین صاحب برتر خیر آبادی (ریٹائرڈ ہوم ڈسپل آفیسر ریاست گوالیار) منعقد ہوا۔ نواب حاجی رئیس الاسلام صاحب رئیس گوپامئو نے اپنی ایک مختصر سی افتتاحی تقریر میں حاضرین جلسہ کو متوجہ کرتے ہوئے اردو ادب کی ترویج و ترقی کی ضرورت پر کافی روشنی ڈالی۔

علاوہ مقامی شعراء کرام کے ضلع کے مقتدر شعراء نے بھی شرکت فرمائی۔ جن میں چند قابل ذکر ہیں سید فیاض علی صاحب فیض شاہ آبادی سید ظفر حسین صاحب ظفر رئیس پہانی، مولوی محمد عمر صاحب عمر وکیل ہردوئی، مولوی محمد عیسےٰ صاحب اڈیٹر آزاد اخبار ہردوئی، اور سید اعجاز حسین صاحب اعجاز پہانی، حافظ قاری سید شاہد حسین صاحب رئیس بلگرام بھی شریک مشاعرہ ہوئے

۱۲ بجے شبکو مشاعرہ ختم ہوا جسمیں سب سے زیادہ قابل شکریہ صدر صاحب انجمن ترقی اردو ہیں جنکی توجہ اور مساعی سے اکثر قصبہ میں اس قسم کے علمی اور ادبی جلسے ہوتے رہتے ہیں۔

منجانب انجمن چاء اور طعام سے معزز مہمانوں کی ضیافت کیگئی۔

سکریٹری مشاعرہ

زبان کا مسئلہ

شری آر آر دیواکر نے پارلیمنٹ میں ریڈیو کی زبان کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

کہ حال ہی میں جو مشاورتی کمیٹی قائم کی گئی تھی وہ اس مسئلہ میں غور کررہی ہے۔ اور پہلی ہی میٹنگ میں اس نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کی زبان کا معیار یہ ہو کہ زیادہ سے زیادہ سمجھی جاسکے۔ آل انڈیا ریڈیو کوئی خاص زبان کی ترویج کے لئیے اکیڈمی نہیں ہے۔ ہم ایسی زبان کو ترقی دینا چاہتے ہیں جس کو نہ صرف ہندی بولنے والے سمجھہ سکیں۔ بلکہ ہندی نہ بولنے والے بھی

رامپور میں انجمن ترقی اردو کی شاخ کا قیام

رامپور ۱۸ اپریل۔ انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کرنے کے لئیے آج شام صولت پبلک لائبریری میں رامپور کے شہریوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں رگھونندن صاحب شوق سابق لامیر کو انجمن کا صدر، سابق وزیر تعلیم مسٹر دیو کی نندن اور مسٹر امتیاز علی صاحب عرشی ناظم سرکاری کتب خانہ کو نائب صدر چنا گیا۔ مسٹر شیر علی خان شکیب کو سکریٹری ماسٹر ہزاری لال اور کلب علی خان صاحب کو جوائنٹ سکریٹری منتخب کیا گیا۔ ایوان عام کے چالیس ممبروں کا بھی انتخاب کیا گیا۔ آج کے جلسہ کی صدارت مولوی ضیاء اللہ خانصاحب نے کی۔

(نامہ نگار)

اپنے دیس کی خبریں

مونگیر ۱۵ اپریل۔ حلقہ ادب مونگیر کا ایک جلسہ مورخہ ۱۴ اپریل ۵۰ء کو زیر صدارت جناب مجیب الحق صاحب منعقد ہوا۔ جلسہ میں سعید اختر صاحب سکریٹری حلقہ ادب پٹنہ نے جو بہار ریاستی اردو کانفرنس کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ اردو کانفرنس کی اہمیت اور اس کی ضرورت پر روشنی ڈالی۔ جلسہ میں متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ حلقہ ادب مونگیر اس کانفرنس میں کلی طور پر اشتراک کرے اور اپنا نمایندہ بھیجے۔

(ساتھی پٹنہ)

وارث نگر (دربھنگا) ۵ اپریل ۱۹۵۰ء ادبستان موضع منیار پور ڈاک خانہ وارث نگر (دربھنگا) کا ایک عام جلسہ زیر صدارت جناب اختر احسن صاحب منیارپوری ہوا۔ ظہیر الحق صاحب سکریٹری ادبستان نے رپورٹ پڑھی اس کے بعد بجٹ پیش کیا۔ کچھ ترمیمیں منظور کی گئیں۔ سال رواں کے لیئے حسب ذیل حضرات چنے گئے۔

۱- ڈاکٹر سید محمد کاظم صاحب وی آئی .... نگران
۲- محمد ظہیر الحق صاحب .... صدر
۳- ظہیر الحق صاحب اسیر جنرل سکریٹری
۴- آغا حسن خورشید کاظمی - جوائنٹ سکریٹری
۵- حساس منیارپوری - نمائندہ خصوصی
۶- "ظ" منیارپوری - انچارج نشرواشاعت و لائبریرین
۷- مولانا شمس الہدی صاحب - خازن (نائب امام شاہی مسجد منیار پور)

بعدہ طے پایا کہ عہدیداران ادبستان کا ایک جلسہ وسط جون میں کیا جائیگا جس میں یہ طے کیا جائیگا کہ ادبستان کو انجمن ترقی اردو (ہند) سے الحاق کیا جائے یا نہیں۔ بعد کارروائی جلسہ اسیر صاحب نے ایک مقالہ اور حساس صاحب نے ایک نظم پڑھی۔ جسے حاضرین نے بہت پسند کیا۔

بہار ریاستی اردو کانفرنس کا انعقاد

پٹنہ ۱۸ اپریل:- پٹنہ میں بہار ریاستی اردو کانفرنس کا انعقاد ۱۲-۱۳ اور ۱۴ مئی کو ہوگا اس کانفرنس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کریں گے۔

اس موقع پر ایک مشاعرہ بھی ہوگا مشاعرہ کا افتتاح سر سید سلطان احمد اور صدارت آنریبل ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیر ترقیات حکومت بہار کریں گے۔

مجلس عاملہ کی نشست مورخہ ۲ اپریل نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس موقع پر ریاست بہار کے تمام لکھنے والوں کے لئے مقالہ، افسانہ اور نظم کا مقابلہ کیا جائے۔ ریاست کے ہر شخص کو اس انعامی مقابلہ میں شریک ہونے کا مجاز ہوگا۔ لیکن افسانہ اور نظم کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی ہے۔ بہترین افسانہ کے لئے سو روپے اور بہترین نظم کے لئے سو روپے کے انعامات ہیں۔ بہترین مقالہ کے لئے بھی سو روپیہ کا انعام دیا جائیگا مقالہ کا عنوان یہ ہے۔

"ہندستان میں اردو کا مستقبل"

اس کانفرنس کے موقعہ پر حلقہ ادب، بہار صوبہ بہار کے گذرے ہوئے شاعروں کی روحوں کا ایک تمثیلی مشاعرہ پیش کرے گا۔ تمثیلی مشاعرے کے سلسلے میں حلقہ ادب، بہار کے تمام اراکین بہت سرگرمی سے کام کر رہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ تمثیلی مشاعرہ گذشتہ سالوں کے تمام پچھلے ریکارڈ توڑ دیگا۔

کانفرنس کا پروگرام مندرجہ ذیل ہے۔

۱۲ مئی ساڑھے ۶ بجے شام - پہلی نشست افتتاحیہ اجلاس۔
۱۳ مئی ۷ بجے صبح - دوسری نشست، مجلس مضامین۔
۱۳ مئی ۲ بجے دن - تیسری نشست کھلا اجلاس (تجاویز وغیرہ)
۱۳ مئی ساڑھے ۶ بجے شام - چوتھی نشست مشاعرہ۔
۱۴ مئی ساڑھے ۷ بجے شام - آخری نشست صوبہ بہار کے گذرے ہوئے شاعروں کی روحوں کا تمثیلی مشاعرہ۔

(پیش کردہ حلقہ ادب، بہار)

بہار ریاستی اردو کانفرنس کی مکمل حمایت

پٹنہ ۲۲ اپریل :- بہار صوبائی جمعیۃ الراعین کانفرنس کا یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ چونکہ ریاست بہار کے تمام راعین کی مادری زبان اردو ہے اور یہی زبان ہماری گفتگو، خط و کتابت اور پڑھنے لکھنے کا ذریعہ ہے اور اسی زبان میں ہماری تہذیب و تمدن اور تاریخ موجود ہے۔

لہٰذا ریاست بہار کا ہر راعی اردو پڑھے، اردو لکھے اور اردو بولے اور اردو کی ترویج و ترقی کے لئے کوشاں ہو اور اس کی بقا کے لئے کوشش کرے۔ ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ملک کی سرکاری زبان ہندی بہ خط دیوناگری قرار پا چکی ہے۔ اور حکومت بہار نے اسے دفتری زبان مان لیا ہے۔

یہ جلسہ تمام راعیوں نیز تمام اردو دانوں سے اپیل کرتا ہے اور انہیں مشورہ دیتا ہے کہ بلا تاخیر سرکاری زبان سیکھیں اور اس میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کریں تاکہ وہ پیچھے نہ رہ جائیں اور اس کے باعث انہیں نقصان نہ پہونچ جائے۔

یہ بہار صوبائی جمعیۃ الراعین کانفرنس، بہار ریاستی اردو کانفرنس کی پرزور حمایت کرتی ہے جو ۱۲-۱۳-۱۴ مئی کو پٹنہ میں ہو رہی ہے۔ نیز یہ اجلاس اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ جمعیۃ الراعین کی تمام ہمدردیاں بہار ریاستی اردو کانفرنس کے ساتھ ہیں۔

"پرچھائیں کی پرچھائیاں"

(اہل نظر کیا کہتے ہیں)

انجمن کی پہلی اشاعت، آصف علی صاحب کی "پرچھائیں" کے متعلق دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اپنی نشری تقریر میں ریڈیو پر جو خیالات ظاہر کئے وہ ایک صاحب نظر اور صاحب ذوق ادیب کے خیالات ہیں انہوں نے فرمایا:۔

<u>پرچھائیں</u> | اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل قدر کتاب آصف علی صاحب کی "پرچھائیں" اور اس کا دوسرا رخ ہے۔ یہ کتاب انہوں نے احمد نگر کے قلعے میں لکھی تھی۔ ۱۹۴۲ ع کی تحریک ہماری سیاسی تاریخ کے علاوہ ادب میں بھی بہت اہم ہے۔ جیل میں بیٹھکر پنڈت نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر محمود سب نے کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن زیادہ تر ماضی کے متعلق ہیں یا مستقبل کے، جیل کی زندگی عجیب ہوتی ہے اس میں قیدی یا ماضی کی طرف دیکھ سکتا ہے یا مستقبل کی طرف، لیکن آصف علی صاحب نے ایک ایسی بات ڈھونڈی ہے جو ماضی اور مستقبل کا سنگم ہے اور ازل اور ابد کا ملاپ، انہوں نے حقیقت کی کھوج لگائی ہے اور ظاہر ہے کہ حقیقت کسی ایک زمانے کی کوٹھری میں مقید نہیں رہتی۔

حقیقت کیا ہے یہ کسی کو نہیں معلوم اس پر ایک خوبصورت پردہ پڑا ہوا ہے۔ اور ہم صرف اس کے نقش و نگار کو حقیقت سمجھتے ہیں۔ ہمیں صرف حقیقت کی پرچھائیں نظر آتی ہے۔ حقیقت نظر نہیں آتی۔ لیکن اس پرچھائیں اور حقیقت میں بھی ایک تعلق ہے بقول آصف علی صاحب:۔

"یوں تو حقیقت خود افسانہ زلف ہے مگر اسکی پرچھائیں اس سے بھی طولانی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ حقیقت سے پرچھائیں گریزاں ہے یا پرچھائیں سے حقیقت۔ دونوں اپنی سرحدوں میں ایک دوسرے سے اجتناب کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے قد و قامت کا خاکہ اڑاتا ہے۔ جدا رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دامن وابستہ رہتا ہے۔ نہ اصل کو عکس سے چھٹکارا ہے نہ عکس کو اصل سے اگر پرچھائیں اصل ہو جائے تو اپنی حقیقت سے نا آشنا نہ رہے اور اگر اصل پرچھائیں ہو جائے تو خود آپ کو بھی نہ پہچانے ………… یہیں ماضی اور مستقبل ملتے ہیں۔ یہیں ہستی کے غرفہ سے عدم اور عدم کے جھروکے سے ہستی ایک دوسرے کو جھانکتے ہیں۔ یہی پرچھائیں ہے یا مایا کا سایہ ہے۔

یہ میں اپنی پرچھائیں سے یعنی میں کے علاوہ جو کچھ ہے اس سے ٹکراتا ہے اور اس سے زندگی میں رس اور لگاتار کام کرنے کا

جذبہ پیدا ہوتا ہے ۔ یہہ زمانہ کے دھارے میں بہہ رہا ہے۔ لیکن زمانے کی رونق اسی سے ہے ۔ یہہ دنیا اسی کے پندار کا صنم خانہ ہے اور یہہ زمان و مکان اس کی شوخیِ افکار کا نتیجہ یہہ 'میں' اپنے راستے سے رکاوٹوں کو دور کرتا ہے اور مشکلات کا مقابلہ کر کے ان پر غالب آتا ہے اس کے دل میں آرزو کا دیا روشن ہے اور اس آرزو کی شعاع سے اسکا جیون جگمگاتا ہے ۔ حسن اور عشق کی کشمکش بھی اسی وجہ سے ہے لیکن اگر وقت اس رہٹ کھڑی کو الٹا کے رکھہ دے تو کیا ہو ۔ بقول آصف علی صاحب وہ ایک حقیقت جو آج اور آب کی تنگنائے میں ہے۔ ماضی کے شیشہ میں جمع ہوتی رہی ہے مستقبل کے شیشے میں گرنے لگے ۔ مستقبل ۔ ماضی اور ماضی مستقبل ہوجائے، پرچھائیاں الٹ پڑیں وقت کا دریا عدم کے سمندر سے پھوٹ نکلے اور وادی و صحرا کو طوفان بے پناہ سے زیر آب کرتا ہوا پہاڑوں کے سینوں میں واپس جا پہنچے موت کی جھولی خالی ہوجائے زندگی کی ہوا کا رخ بدل جائے، بڈھے جوان ہوجائیں جوان بچے اور بچے رحم مادر میں تخم اور تخم محبت کے شعلے میں چنگاری ۔ اس الٹ پلٹ اور اوٹ پھیر کا نتیجہ یہہ ہوگا کہ حسن و عشق ایک نظر آئینگے اور دوئی کا پردہ ہٹ جائے گا ۔ دلچسپ بات یہہ ہے کہ اس تبدیلی کے باوجود ہر چیز جوں کی توں نظر آئیگی ۔ آج خواہ مستقبل کے بطن سے پیدا ہو یا ماضی کے پھول مٹی سے نکلیں یا پھول سے مٹی ۔ دریا سوت کی طرف جائے یا سوت دریا کی طرف بات ایک ہی ہے ۔ یعنی حیات جاوید ہے'

آصف علی صاحب نے ان نازک اور دقیق مطالبات کو اس طرح ادا کیا ہے ۔

"عشق میں حسن ہے کہ حسن میں عشق ۔
ایک میں دوسرا اس طرح چھپا بیٹھا ہے،
جیسے چاند میں چاندنی اور سورج میں
دھوپ، جسم میں جان ہے کہ جان میں جسم

دھوپ کے ساتوں نہیں لاکھوں رنگ ۔ شیشے کے آویزے کی کھڑکی میں سے جھانکتے ہیں جان بدن کی ٹھوکر نہ کھائے تو خاک میں نہ لوٹے ۔

بدن کے کنارے نہ روکیں تو جان کا دریا اور ہستی کا سمندر ایک ہوجائے عشق کے دروازے سے حسن آتا جاتا ہے ۔

امید کی چاندنی اور آرزو کی دھوپ علیحدگی کی کالی رات کا دروازہ جھانکتے ہیں خاک کی چھلنی میں آرزو جیون کے حسن کی چاندنی اور جسم کے آویزے میں جان کی دھوپ جیون کے رنگ کی قوس قزح بن جاتی ہے ۔

تم وہ بیج ہو جس میں میری تمنائیں ہوتی ہیں ۔ تم میرا روز ازل میری قیامت تم ہو تم نہ ہو تو میری آرزؤوں کے پھول کہاں کھلیں؟"

آگے چل کر لکھتے ہیں ۔

تم ہی کہو۔ دریا کا اتار اچھا ہے یا کنوار کی پھوار؟
خاموشی کا پہاڑ بھلا ہے یا بین کی جھنکار؟
میرے لئے اتار چڑھاؤ دونوں ایک ہیں
اسی اتار چڑھاؤ میری زندگی کا بہاؤ ہے
اسی اتار چڑھاؤ میں میرے سکھہ کا سنگھار ہے
یہی امر جیون ہے ۔"

یہیں پہنچ کر موت ۔ موت نہیں رہتی بلکہ اسی جگہ تھکا ہارا مسافر کچھہ دیر ٹھیرتا ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے یہہ تسبیح کا سا چکر ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا ۔ یہہ رہٹ گھڑی کا سلسلہ ہے جو یوں ہی چلتا رہے گا ۔ کلیاں مرجھا جاتی ہیں تو پھول پیدا ہوتے ہیں ستارے مرجھاتے ہیں تو صبح کا چہرہ نظر آتا ہے زندگی ہزاروں بھیس بدلتی ہے لیکن قایم رہتی ہے انسان ایک مقصد کے حاصل ہوتے ہی فوراً دوسرے مقصد کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے ۔ اور اپنی کوشش کے لئے نئے میدان ڈھونڈتا ہے ۔ لیکن یہہ میں کی قوت بناتی بھی ہے اور بگاڑتی بھی ہے اس لئے اسکی

صورت انسان کی ہے لیکن کام حیوان کے سے ہیں ۔ آنکھوں میں مَے کا نشہ ہاتھوں میں کٹے ہوئے سر، اور پھر سوکھی ہوئی کھوپڑیوں کے ڈھیر پر، بہت ممکن ہے یہہ انسان نما جس کے کام حیوان سے زیادہ برے ہیں ان کھوپڑیوں میں مل جائے اور ایک بہتر انسان فوق البشر یا (Superman) پیدا ہو جائے جو ہمارے ہر قسم کے دکھ درد کا علاج ہوگا اور جس کے انتظار میں یہہ دنیا نہ معلوم کب سے بے چین ہے آصف علی صاحب کا خیال ہے کہ یہہ فوق البشر بھی زندگی کی بہت سی منزلیں طے کر لیگا اور آخر میں پروانے کی طرح شمع ابدی پر قربان ہو جائیگا ۔ آصف علی صاحب کا یہہ افسانہ اردو کے تمام افسانوں سے مختلف ہے لیکن اس میں وہ تمام رنگینیاں اور دلچسپیاں موجود ہیں جو اچھے افسانہ میں ہوتی ہیں یہہ نہ نثر ہے نہ نظم ۔ مگر اس میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو نظم میں ہوتی ہیں اور تمام وہ برائیاں نہیں ہیں جو نثر کے سر لگائی جاتی ہیں نظم میں جو پابندی اور مجبوری ہوتی ہے وہ یہاں نہیں ہے انہوں نے حقیقت کی اس کہانی کو لالہ و گل کے پردے میں ادا کیا ہے ۔ اس انداز نگارش سے کتنے فائدے ہوئے ۔ ایک تو مضمون کی خشکی دور ہو گئی دوسرے افسانہ میں بے پایانی پیدا ہو گئی ۔ ہر اچھا ادب زمانہ اور وقت کی دیواروں کو توڑ کر بے پایاں ہونا چاہتا ہے اسکی اہمیت ایک دو مہینہ نہیں رہتی بلکہ ہمیشہ ہر موسم میں یہہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب بیان میں دلیری ہو اشارے اور کنائے ہوں اور جو بات کہی جائے وہ دشنہ و خنجر اور بادہ و ساغر کے پیرائے میں کہی جائے ۔

آصف علی صاحب نے فلسفیانہ مسائل کو اس خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے کہ وہ محبت کی داستان معلوم ہوتی ہے اس کتاب کی اشاعت نے زبان کی سرحدوں کو بھی وسیع کر دیا ہے ۔ حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے اتنے نازک اور دقیق مسائل کو ایسی سادہ اور آسان زبان میں کیسے سمو لیا ۔ ان کی زبان ایسی صاف ستھری سادہ اور رنگین ہے کہ اس سے بہتر کا خیال نہیں کیا جا سکتا ۔ ان میں سے ایک خوبی بھی اس کتاب کو ادب میں بڑا درجہ دلوا سکتی تھی ۔ لیکن ان سب خوبیوں نے مل کر اسے زندۂ جاوید بنا دیا ۔ اس کتاب کے اسلوب کی تعمیر میں قید خانہ کی زندگی کو بھی بڑا دخل ہے قیدی صرف قید خانوں کی منڈیروں سے جھانک سکتے ہیں ۔ اور شاعرانہ انداز بیان ہی میں ذرا ہاتھ پاؤں پھیلا سکتے ہیں اور انگڑائیاں لے سکتے ہیں ۔ مصنف نے لکھا ہے ۔

" اگر کہیں کہیں اوزان کی بھی پرچھائیں آجائے تو اسے اسانش قید و بند کی عادت پر محمول سمجھا جائے ۔ نیند سے جاگ کر بھی بار بار آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور خواب حقیقت سے آگے نکل جاتا ہے "

ہندوستان کا سب سے بڑا ادبی مرکز
کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی
جہاں انجمن ترقی اردو ۔ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ندوۃ المصنفین دہلی وغیرہ کی معیاری مطبوعات اور ہر علم و فن کی کتابیں ہر وقت موجود رہتی ہیں ۔ اگر آپ کو کتابیں پڑھنے کا شوق ہے تو ہم سے خدمت لیں ۔ ہم کتابوں کی فراہمی میں خواہ وہ کہیں کی چھپی ہوئی ہوں زیادہ سے زیادہ سہولت اور کفایت کا لحاظ رکھتے ہیں ۔
فہرست مفت طلب کیجئے ۔
"مہتمم"
کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی

باہتمام عزیز حسین مینیجر مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ چھپا اور قاضی عبدالغفار صاحب پبلشر نے صدر دفتر انجمن ترقی اردو علی گڑھ سے شائع کیا ۔